رسومِ اقوام

علی عباسؔ جلالپوری

فہرست

1 پیش لفظ

2 ولادت

3 بلوغت

4 بیاہ

5 طلاق

6 موت

7 مذہبی رسمیں

8 اجداد پرستی

9 صابئیت

10 لنگ پوجا

11 ناگ پوجا

12 قربانی

13 کھانا پینا

14 چائے ، کافی

15 پان

16 تمباکو

17 منشیات

18 لباس

19 وضع قطع، زیبائش

20 آداب و اطوار

21 طبقات معاشرہ

22 تفریحات

23 تہوار

24 شاہیت

25 جرم و سزا

26 بردہ فروشی

27 بنج بیوہار

28 توہمات

29 عصمت فروشی

30 سادھو، سنت، فقیر

31 طب

32 حمام

33 ٹے بو

34 ضمیمہ

پیش لفظ

علمِ انسان کے مطالعے کے دوران میں راقم السطور کو اقوامِ عالم کی رُسوم کا جائزہ لینے کا موقع مِلا اور اِس ضمن میں چند دلچسپ انکشافات ہوئے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ رسمیں بڑی حد تک آپس میں ملتی جلتی ہیں مثلاً مینہ برسانے کے ٹوٹکوں میں ہر کہیں کسی نہ کسی صورت میں زمین پر پانی گرایا جاتا ہے تاکہ بادل کو برسنے کی ترغیب ہو۔ اسی طرح جادو کے ٹونے ایک جیسے ہیں مثلاً کسی کو جان سے مارنا ہو تو اُس کا کپڑے کا پُتلا بنا کر اُس میں سُوئیاں چبھوتے ہیں یا اُس کا مٹی کا پُتلا بنا کر بہتے ہوئے پانی میں رکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح بیاہ کی رسمیں دُلہا دُلہن کو نظرِ بد یا آسیب سے بچانے کے لئے وضع کی گئی تھیں۔ مَرے ہوئے بزرگوں کی قبروں پر منتیں ماننے، حصولِ اولاد کے لئے قبروں پر اُگے ہوئے پیڑوں سے چیتھڑے لٹکانے، مَرے ہوئے بزرگوں کی رُوحوں کی ضیافت کرنے کی رسمیں آج بھی اکثر ایشیائی اقوام میں دکھائی دیتی ہیں۔ رُوحوں سے رابطہ قائم کرنے کے لئے کم و بیش ملتے جُلتے ٹونے کئے جاتے ہیں۔ دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ اکثر معاشرتی رسموں میں جادو، ارواح کے مَت اور قدیم مذہب کے شعائر کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ زمین کی بار آوری کو تقویت دینے کے لئے تمام قدیم مَتوں میں لنگ پوجا کا رواج تھا۔ یہ روایت آج بھی ہندوستان میں باقی ہے۔ چوری کا حال معلوم کرنے، دفینوں کا سُراغ لگانے اور غیب کا احوال معلوم کرنے کے لئے کم و بیش ایک جیسے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔

سب سے آخر لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ مروّجہ رسوم زرعی معاشرے کے ابتدائی

دَور میں صورت پذیر ہوئی تھیں۔ سائنس کے فروغ سے پہلے لوگ فطری قوانین سے ناواقف تھے اور قدرتی مظاہر کی توجیہہ فکر سے نہیں تخیّل سے کیا کرتے تھے۔ وہ روحوں کی پوجا کرکے اُن سے مدد مانگتے، دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے مندروں پر چڑھاوے لے آتے اور جادو کے ٹونے ٹوٹکوں سے کائنات کو مسخّر کرنے اور موت اور فنا پر قابو پانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے عالم میں رہتے تھے جس پر خوف و دہشت اور اوہام و خدشات کے سائے چھائے ہوئے تھے۔ مرورِ زمانہ سے رسُوم و روایات کی گرفت انسانی ذہن پر اِس قدر مضبوط ہوگئی کہ وہ اقوام جن میں سائنس کے انکشافات کی روشنی میں معاشرے کو ازسرِ نو مرتّب نہیں کیا گیا آج بھی زرعی معاشرے کی فرسودہ رسُوم و روایات سے پیچھا نہیں چھڑا سکیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے ہاں سائنس کو بلاشبہ بے پناہ ترقی نصیب ہوئی ہے لیکن سائنس کا اندازِ تحقیق اُن کے مزاجِ عقلی میں نفوذ نہیں کر سکا۔ وہ جدید صنعتی معاشرے میں رہتے ہوئے بھی زرعی دَور کی رسُوم و روایات کے طلسم میں گرفتار ہیں البتّہ اُن اقوام میں جہاں سائنس کو علمی تحقیق کے ساتھ ساتھ اُس کی روشنی میں صنعتی معاشرے کو نئے سرے سے مرتّب و متشکل کر لیا گیا ہے، پُرانی رسمیں مِٹ مٹا کر رہ گئی ہیں۔ بہرصورت جس طرح مورخینِ تمدّن کسی ملک کے عجائب گھروں میں جاکر اُس کے ماضی کی تاریخ مرتّب کر سکتے ہیں اسی طرح قدیم رسُوم و روایات کا مطالعہ پوری نوعِ انسان کے فکری و ذہنی ارتقاء کا جائزہ لینے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اِس پہلو سے رسُوم و روایات کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی اور اِن کا تجزیہ تقابلی مذہب، جادو، علمِ انسان، نفسیات اور عمرانیات کے طلبہ کے لئے سُود مند ثابت ہوتا رہے گا۔

علی عباس جلالپوری

جلال پور شریف

۲۳۔ مارچ ۱۹۸۳ء

ولادت

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ بے اولاد عورت اُس پیڑ کی مانند ہے جس کو پھل نہ لگے۔

اِس میں شک نہیں کہ عورت کی حقیقی پہچان اُسی وقت ہوتی ہے جب وہ ماں بن جائے۔ بانجھ اور بے اولاد عورت کو ہر کہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں تو اُس عورت کو بھی بدبخت اور منحوس سمجھتے ہیں جو اولادِ نرینہ سے محروم ہو چنانچہ عورتیں حصولِ اولاد کے لئے ولیوں کے مزاروں پر مَنتیں مانتی رہتی ہیں۔ ہندوستان کی مسلمان عورتیں شیخ سدّو یا میراں صدرالدین کے مزار واقع امروہہ میں مٹھک دیتی ہیں جس پر انہیں حال آجاتا ہے اور وہ بے اختیار ہاتھ پاؤں چلانے لگتی ہیں۔ عورتیں اس مقصد کے لئے بزرگوں کے مزاروں پر اُگے ہوئے پیڑوں کی ٹہنیوں سے رنگ برنگ کی دھجیاں باندھتی ہیں جنہیں لنگوٹی پیر کہتے ہیں۔ ہندو مسلمان عورتیں شیخ سلیم چشتی کے مزار واقع فتحپور پر حصولِ اولاد کے لئے مَنتیں مانتی ہیں کہ جس طرح شیخ کی دُعا سے جلال الدین اکبر کے گھر سلیم پیدا ہوا تھا اسی طرح اُن کے روحانی تصرف سے ہماری کوکھ بھی ہری ہو جائے۔ نجد میں بانجھ عورتیں ضرار بن ازور کی قبر پر اُگے ہوئے درخت سے ہمکنار ہوا کرتی تھیں۔ اِس درخت کو محمد بن عبدالوہاب نے کٹوا دیا۔ بلوچی عورتیں اولاد کی خاطر شاہ وساوا کے مزار پر اُگے ہوئے درخت سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ بلوچستان میں بانجھ عورت کو ایک چھڑے کے نیچے سے گذارتی ہیں جو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا ہو۔

مشرقی ممالک میں ایک عالمگیر توہّم یہ ہے کہ بد رُوحوں کی پکڑ یا سایہ عورت کو بانجھ کر دیتا

ہے چنانچہ ایسی عورت کو الائچی، لونگ یا قند دم کرکے کھلاتے ہیں یا اُس کے پیٹ سے گنڈا باندھ دیتے ہیں۔ بعض علاقوں میں کسی ولی کی قبر پر تنے ہوئے شامیانے کی چوبوں سے چھلّے لٹکاتی ہیں اور اولاد کے لئے منت مانتی ہیں۔ حصولِ اولاد کے لئے پیرزادوں سے بھی رجوع لاتے ہیں۔ پولیس کے کاغذات میں کئی ایسے اغوا کے واردات محفوظ ہیں کہ بعض نوجوان پیرزادے عورتوں کو بہلا پھسلا کر لے بھاگے۔ ہندو عورتیں اولاد کی خاطر کاشی جاتی ہیں جہاں بسا اوقات وہ مکار مہنتوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں۔ مہنت عورت کو مندر ہی میں شب باش ہونے کی ہدایت کرتا ہے۔ اگلی صبح عورت گذشتہ شب کی تاریکی میں ہونے والا واقعہ کہہ سنائے تو مہنت گمبھیر لہجے میں کہتا ہے "دھنیواد! تم کتنی بھاگوان ہو، رات کو خود بھگوان چل کر تمہارے پاس آئے تھے۔" بانجھ پن کو دور کرنے کا ایک ٹوٹکا بڑا خطرناک ہے۔ بانجھ عورت کسی کے بچے کو مٹھائی وغیرہ کا لالچ دے کر اپنے گھر لے جاتی ہے اور اُسے کانسی کی چھری سے ذبح کرکے اُس کے خون میں نہاتی ہے۔ خیال یہ ہے کہ اس طرح مقتول کی روح عورت کی کوکھ میں چلی جائے گی اور اُس کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا۔ ایسی کئی عورتیں قانون کی گرفت میں آجاتی ہیں۔

جب حمل کے آثار ظاہر ہوں تو عورت کو بہ یک وقت آسودگی اور خوف کا احساس ہوتا ہے۔ بچہ پہلوٹھی کا ہو تو دلہن کا خوف دہشت میں بدل جاتا ہے اور وہ سہیلیوں سے اکثر اپنی موت کا ذکر کرتی رہتی ہے۔ ایک خوف یہ بھی لاحق ہو جاتا ہے کہ مبادا وہ زچگی میں مر کر چڑیل بن جائے۔ کتابِ مقدس میں لکھا ہے کہ خداوند نے ممنوعہ پھل کھانے اور آدم کو بھی کھلانے پر سرزنش کرتے ہوئے حوا سے کہا تھا[1]

"میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا۔ تو درد سے بچہ جنے گی۔"

حاملہ کو اسقاط کا اندیشہ بھی ستاتا رہتا ہے۔ ایران میں اُسے اسقاط سے محفوظ رکھنے کے لئے اُس کی کمر

[1] عہد نامۂ قدیم

سے دو رنگوں کا بٹا ہوا دھاگا لپیٹ دیا جاتا ہے شرط یہ ہے کہ اسے کسی بچی نے بٹا ہو۔ جب بچی دھاگا بٹ رہی ہوتی ہے تو مُلّا سورۃ یٰسین کی تلاوت کرتا رہتا ہے۔ جہاں کہیں "مبین" کا لفظ آجائے دھاگے میں گرہ ڈال دی جاتی ہے اور گرہ پر مُلّا دم کرتا رہتا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ حاملہ کے شکم میں بیٹا ہے یا بیٹی اُس کے سرہانے ایک طرف قینچی اور دوسری طرف چاقو رکھ دیتی ہیں۔ اگر سوتے میں حاملہ کا رُخ چاقو کی طرف پھر جائے تو کہتی ہیں کہ لڑکا ہوگا ورنہ لڑکی۔ بلوچوں میں سانپ کو مار کر حاملہ کو اُس پر سے گذارتے ہیں۔ پھر سانپ کو ہوا میں اُچھالتے ہیں، وہ پیٹھ کے بل گرے تو کہتی ہیں کہ لڑکا ہوگا ورنہ لڑکی۔

سُورج گرہن اور چاند گرہن کے دوران میں حاملہ اور اُس کے شوہر کو چاقو چھُری سے کوئی شے کاٹنا منع ہے کیوں کہ ایسا کرنے سے بدرُوحیں جن کی گرفت میں سُورج اور چاند ہوتے ہیں جنین کو ضرر پہنچاتی ہیں اور اس کے بدن پر داغ دھبّے ڈال دیتی ہیں۔ ایک ٹَبُو[1] یہ ہے کہ حاملہ گرہن پر ناریل یا زیر زمین اُگنے والی کوئی سبزی نہیں چھُو سکتی کہ اِس طرح وضع حمل میں مشکل پیدا ہو جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ ہندوستان کے بعض علاقوں میں حمل کے ساتویں ماہ شوہر سر کے بال نہیں کٹواتا۔ برہمنوں میں حمل کے ساتویں ماہ کی نئی چاند رات کو سات اناج پکا کر کھلاتے ہیں جسے سَت نَجا کہا جاتا ہے۔ یہ کھانا رشتے داروں میں بٹتا ہے جو تحائف بھیجتے ہیں۔ نویں ماہ نَو ماسہ کی تقریب منائی جاتی ہے اور ایک خوفناک ڈائن نونّاں چماری کی پُوجا کی جاتی ہے تاکہ وہ بچے کو نہ کھا جائے۔ ایرانی عورتیں ایک عفریت آل نامی سے ڈرتی ہیں کہ وہ کوکھ میں گھُس کر بچے کو جان سے مار دیتا ہے۔ ایرانی عورتیں لڑ پڑیں تو ایک دوسری کو کہتی ہیں "آلت بزند"

عربی ممالک میں زچہ کو وضع حمل کے وقت جس چوکی پر بٹھاتے ہیں اُسے کرسی الولادۃ

---

[1] TABOO

کہا جاتا ہے۔ نپولین سے پہلے فرانس میں رواج تھا کہ ملکہ برسرِعام بچہ جنتی تھی۔ وضعِ حمل کے وقت محل کے دروازے کھول دئے جاتے اور عورتیں مرد اندر ہجوم کر آتے۔ ملکہ میری انتوانت نے اسی عالم میں سیکڑوں لوگوں کے سامنے بچے کو جنم دیا تھا۔ خیال یہ تھا کہ کسی کو یہ شک نہ ہو کہ بچہ بادشاہ کا نہیں ہے کسی دوسرے کا لاکر رکھ دیا گیا ہے۔

ایران میں وضعِ حمل میں دِقت ہو تو زچہ کی ران پر تعویذ باندھ دیتی ہیں اور ایسا پانی پلاتی ہیں جس میں کسی بزرگ کی ڈاڑھی ڈبوئی گئی ہو۔ پٹھانوں کے ہاں یہ رسم ہے کہ دایہ پانی لاتی ہے جس سے زچہ کا شوہر اپنا منہ اور پاؤں دھوتا ہے پھر یہ پانی زچہ کو پلا دیا جاتا ہے۔ اِس موقع پر ایرانی عورتیں کسی نوجوان لڑکی کا لباس پھاڑ دیتی ہیں کہ اِس طرح بچہ جننے میں آسانی ہوگی۔ ایران اور پنجاب میں وضعِ حمل کو آسان بنانے کے لئے زچہ کو تین کھجوریں کھلائی جاتی ہیں کیوں کہ روایت کے مطابق مریم عذرا نے مسیح کی پیدائش پر تین کھجوریں کھائی تھیں اور درد سے محفوظ رہی تھیں۔ پیدائش کے بعد دایہ نومولود کو عود اور شہد کی گھٹی دیتی ہے۔ پنجاب میں گھی اور شہد کی گھٹی دینے کا رواج ہے۔ اس وقت کسی اجنبی یا حائضہ کو کمرے میں آنے کی اجازت نہیں ہوتی مبادا اُس کا سایہ بچے پر پڑ جائے۔ سوءِ اتفاق سے اِن میں سے کوئی اندر آجائے تو زچہ اور بچہ کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے حرمل کی دھونی دی جاتی ہے۔ ملتان اور بہاولپور میں بچے کے سر کو گول اور خوش وضع بنانے کے لئے اُس کا سر مٹی کے گول پیالے میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات پیدائش کے وقت سر کے بجائے بچے کے پیر باہر آتے ہیں جس سے زچہ کو شدید کرب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جو بچہ اس طرح پیدا ہو اُس کے پاؤں میں خاص قسم کی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے یعنی کسی شخص کو دردِ کمر کی شکایت ہو اور اس طریقے سے پیدا ہونے والا شخص اُس کی کمر میں لات مار دے تو دردِ کمر کو شفا ہو جاتی ہے۔

فردوسی شاہنامہ میں لکھتا ہے کہ پیدائش کے وقت رستم غیر معمولی طور پر فربہ تھا جس سے وضعِ حمل میں بڑی دِقت پیش آئی اور اُس کی ماں درد کی شدت سے نیم جاں ہو گئی۔ آخر خدا خدا کر کے بچہ پیدا

ہوا تو اُس کی ماں نے شکر کرتے ہوئے کہا "رُستم" یعنی میں نے رہائی پائی۔ زال نے یہی اپنے بچے کا نام رکھ دیا۔ بعض اوقات وضعِ حمل میں پیچیدگی پیدا ہو جانے سے زچہ کا پیٹ چاک کر کے بچہ نکالنا پڑتا ہے جیسے کہ جولیس سیزر پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ اس اپریشن کا نام ہی سیزیرین پڑ گیا۔ شکسپیئر اپنے المیہ ناٹک میکبتھ میں لکھتا ہے کہ چڑیلوں نے میکبتھ کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ کوئی ماں کا جنا اُسے مار نہیں سکے گا۔ جب لڑائی کے دوران میکبتھ کی مڈبھیڑ اپنے دشمن میکڈف سے ہوئی تو میکڈف نے اُسے للکارا۔ میکبتھ نے اُس کے سامنے چڑیلوں کی پیش گوئی کا ذکر کیا اور شمشیر بدست اُس پر جھپٹا۔ میکڈف لڑتے لڑتے کہنے لگا "میں ماں کا جنا نہیں ہوں۔ مجھے اُس کا پیٹ چاک کر کے نکالا گیا تھا۔ یہ کہہ کر تلوار کے ایک بھرپور وار سے میکبتھ کو مار کر شہر پناہ کے نیچے پھینک دیا۔

پیدائش کے چھٹے روز بعد چھٹی کی رسم ادا کی جاتی ہے جس میں مرد حصّہ نہیں لے سکتے۔ زچہ کو اُس پانی سے نہلاتی ہیں جسے خوشبودار جڑی بوٹیاں ڈال کر اُبالا گیا ہو۔ بچے کو ایسا کُرتا پہناتی ہیں جو کسی بڈھے کے کپڑے قطع کر کے سیا گیا ہو تاکہ بچے کی عمر طویل ہو۔ ماں ہاتھ میں قرآن پکڑے آنکھیں بند کر کے کمرے سے باہر نکلتی ہے اور آنکھیں جھپکا کر سات بار آسمان کی طرف دیکھتی ہے۔ سات سہاگنیں ست نجا سے ایک ایک لقمہ لیتی ہیں اور پھر زچہ کو کھلاتی ہیں۔ اس تقریب پر خوشی منائی جاتی ہے۔ اس رسم کی تہ میں یہ خیال ہے کہ پہلے پانچ دن بچے کی زندگی خطرے میں ہوتی ہے۔ چھٹے دن وہ چھٹی کی بلا سے نجات پا لیتا ہے۔

قدیم روما میں نو مولود کو پانی سے نہیں شراب سے نہلاتے تھے۔ عیسائیوں کے ہاں بپتسمہ کا رواج ہے جس میں بچے کو زرد رنگ کے پانی میں ڈبکی دیتے ہیں۔ اس پانی پر انجیل کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں۔ مغربی ممالک میں بچے کی پیدائش کے روز ایک پودا بویا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ پودے

کی نشو ونما کے ساتھ ساتھ بچہ بھی پروان چڑھتا رہتا ہے۔ جنم دن منانے کا رواج ایران سے دوسری اقوام میں پھیل گیا۔ سامیوں کے ہاں زچہ چار دن تک ناپاک رہتی تھی۔ ہمارے یہاں چالیس تک سُوتک کے دن شمار ہوتے ہیں۔ چالیسویں روز زچہ اور بچہ کو رسمی طور پر نہلایا جاتا ہے۔ پنجابی میں اسے "چھلا نہانا" کہتے ہیں۔ اس غسل کے بعد زچہ بچہ پوری طرح پاک ہو جاتے ہیں۔ ملایا میں چالیسویں دن بچے کو "آبا پانی" اور "دھرتی ماتا" کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ برہمن نومولود کو باہر لے جاتے ہیں اور سورج دیوتا کے درشن کراتے ہیں۔ ایران میں مجوسی اور ہندوستان میں برہمن نومولود کی جنم پتری تاروں کے حساب سے بناتے ہیں اور اُس کے مستقبل کے بارے میں پیش قیاسی کرتے ہیں۔ زچگی کے ایام میں زچہ کی جسمانی طاقت کو بحال کرنے کے لئے خشک میوے، بادام، پستہ، گری، کھوپا، کشمش وغیرہ کوٹ کر اور گھی میں تل کر کھلاتے ہیں۔ اس خوراک کو دابڑا کہا جاتا ہے۔

امیر گھرانوں میں دودھ پلانے کے لئے دایہ رکھی جاتی ہے جسے چھوچھا کہتے ہیں۔ مُغل بچے کے لئے کھلائی رکھتے تھے جسے انگہ کہا جاتا تھا۔ تاریخ ہند میں جلال الدین اکبر کی دایہ ماہم انگہ کا نام آتا ہے جس نے بادشاہت کے ابتدائی ایام میں درباری سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ انگہ کا بیٹا بادشاہ کا کوکلتاش یا کوکہ کہلاتا تھا۔ بیٹیوں کی رفاقت کے لئے دوسرے گھروں کی بیٹیاں رکھ لی جاتی تھیں جو بڑی ہو کر ان کی گوئیاں بن جاتی تھیں۔

عقیقہ (لغوی معنی نومولود کے سر کے بال جنہیں پنجابی میں جھنڈ کہتے ہیں) کا رواج بڑا قدیم ہے۔ قدیم مصری نومولود کے سر کے بال مونڈوا کر ان کے وزن کے برابر چاندی خیرات کیا کرتے تھے۔ یہودیوں میں عقیقہ کی تقریب دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ نومولود کی پیدائش کے آٹھویں دن اُسے مسجد اقصیٰ میں لے جاتے جہاں اُس کے سر کے بال مونڈواتے تھے اور قربانی کرتے تھے۔ ہمارے ہاں عقیقہ پر بکری

کو انعام دیتے ہیں اور برادری کی ضیافت کی جاتی ہے۔

بچے کا نام رکھنے کی تقریب بھی خوشی سے مناتے ہیں۔ ہندو اسے نام کرم کہتے ہیں اور اپنے بیٹے کے تین نام رکھتے ہیں۔ پہلا نام اکثر نفرت انگیز ہوتا ہے تاکہ بچہ نظرِ بد سے بچا رہے مثلاً دُکھی، کبڑا، بڈھا، کاگی (کوا)، دوسرا نام پنڈت جوتش کے حساب سے رکھتا ہے اور اصل نام پوشیدہ رہتا ہے اور برادری کے باہر کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ اسلام سے پہلے کے عرب بھی بچے کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے کراہت آمیز نام رکھا کرتے تھے مثلاً حنظلہ، حزار، کلب وغیرہ۔ یہودی اپنے بچے کا نام کسی زندہ شخص کے نام پر نہیں رکھتے مبادا وہ جلدی مرجائے۔ ہندوستان میں بچے کی عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ مختلف رسمیں ادا کی جاتی ہیں مثلاً (۱) لڈو باندھنا جب چوتھے مہینے بچہ مٹھیاں باندھنے لگتا ہے (۲) گھنگھنی کی تقریب بچے کے پہلا دانت نکالتے وقت منائی جاتی ہے (۳) رینگنے کی تقریب پر چاولوں سے بنایا ہوا مُرمُرا دوستوں، عزیزوں میں بانٹتے ہیں اور گانا بجانا ہوتا ہے (۴) ہندوؤں میں دودھ چھڑانے کی تقریب کو اَن پرسن کہا جاتا ہے یعنی جب بچہ دودھ پینے کی بجائے اناج کھانے لگتا ہے (۵) بسم اللہ خوانی: جب بچہ چار سال چار ماہ اور چار دن کی عمر کو پہنچ جائے تو بسم اللہ خوانی ہوتی ہے۔ مُلّاجی کے سامنے طرح طرح کے کھانے چُن دیتے ہیں جن پر وہ فاتحہ پڑھتے ہیں اور کھا کر تن تازہ ہوتے ہیں۔ پھر وہ قلم کو صندل کے محلول میں ڈبو کر اس سے تختی پر کلمہ لکھتے ہیں جو بچے کو چٹا دیا جاتا ہے۔ اس تقریب کے بعد بچہ مدرسے میں داخل کرا دیا جاتا ہے۔[1]

بچے کا ختنہ بعض اوقات پیدائش کے بعد ہی کرا دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھار چار پانچ برس کی عمر تک پہنچنے پر کرایا جاتا ہے۔ ختنہ کی رسم مصریوں سے یادگار ہے۔ مصری نامختون کو گندہ سمجھ کر اسے اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتے تھے۔ یونانی حکماء طالیس، فیثاغورس، افلاطون، اقلیدس اور بقراط جب تحصیلِ علوم کے لئے

---

[1] قانونِ اسلام، جعفر شریف

مصر گئے تو انہیں ختنہ کرانا پڑا تھا۔ ختنہ کی یہ رسم یہودیوں کے واسطے سے تمام سامی اقوام میں بار پا گئی۔ جناب عیسیٰ ابن مریم کا ختنہ بھی کیا گیا تھا کیوں کہ وہ اصلاً یہودی تھے۔ بعد میں پال ولی نے ختنہ موقوف کر دیا تاکہ غیر یہودی بھی عیسائیت قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے ختنہ کو ممنوع قرار دیا۔ ہر مغل شہزادے کو تاج و تخت پانے کی آرزو ہوتی تھی اس لیے شہزادے ختنہ نہیں کراتے تھے۔ مغلوں کا ایک قانون یہ تھا کہ کوئی ساقط الاعضا ـــ جس شخص کے بدن کا کوئی عضو کٹ گیا ہو ـــ تخت پر بیٹھ نہیں سکتا تھا۔

لڑکیوں[1] کا ختنہ کرانے کا رواج بھی قدیم مصر اور سوڈان سے لیا گیا۔ اسلام سے پہلے مکہ کی ایک عورت اُم نمر لڑکیوں کا ختنہ کیا کرتی تھی۔ اسے مبظرہ ـــ بظر کاٹنے والی ـــ کہتے تھے۔

ہمارے ہاں کوئی امیر آدمی اپنے بیٹے کا ختنہ کرائے تو اس کے ساتھ دو تین غریب بچوں کا بھی ختنہ کرا دیتا ہے تاکہ اُس کا بیٹا بھی نظرِ بد سے محفوظ رہے۔ کسی غریب کا بچہ نہ ملے تو نائی بدھنے کی ٹونٹی توڑ دیتا ہے۔ مشرقی اقوام میں قدامت پسند لوگ بیٹی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں اور بیٹوں پر فخر کرتے رہے ہیں کیوں کہ وہ بڑے ہو کر قبیلے کی تقویت کا باعث ہوتے ہیں جب کہ بیٹی کو جہیز دینا پڑتا ہے اور ذلت اُٹھانا پڑتی ہے چنانچہ بیٹے کی پیدائش کو سعد اور بیٹی کی ولادت کو نحس سمجھتے ہیں۔ بیٹی پیدا ہو تو گھر میں سوگواری کا عالم دکھائی دیتا ہے، زچہ کو اشاروں کنایوں سے طعنے دیے جاتے ہیں گویا بیٹی کو جنم دے کر اُس سے کوئی جُرم سرزد ہو گیا ہے۔ بیٹے کی پیدائش پر جشن کا سماں ہوتا ہے، ہر طرف مبارک سلامت کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں، ڈوم ڈھاڈی دروازے پر مبارک سلامت کے گیت گاتے ہیں، ہیجڑے ناچ ناچ کر دعائیں دیتے ہیں اور رشتہ داروں سے ویلیں بٹورتے ہیں۔ بعض مذاہب میں بھی اس تعصب کو تقویت دی گئی ہے۔ سنسکرت میں پُتر کا لغوی معنیٰ ہے "پُت (دوزخ) سے بچانے والا" ہندو مت کی رُو سے وہی شخص سورگ (بہشت)

[1] CLITRODECTOMY

میں جا سکتا ہے جس کی چتا کو اُس کا بیٹا آگ لگائے۔ روسہ میں کوئی شخص اولادِ نرینہ چھوڑے بغیر مر جاتا تو کہتے تھے کہ آخرت میں اِسے عذاب دیا جائے گا۔ مجوسیوں کا عقیدہ ہے کہ جس شخص کا بیٹا نہ ہو وہ چنود کے پُل (پُلِ صراط) پر سے گذر نہیں سکے گا۔ پنجابی میں جس شخص کی اولاد نرینہ نہ ہو اُسے اوتر نکھتر کہتے ہیں اور اُسے بدبخت سمجھتے ہیں۔ لفظ اوتر عربی کا ابتر ہے جس کا معنی ہے دُم کٹا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورتیں حمل کے آثار ظاہر ہوتے ہی اولیاء کے مزاروں اور پیروں کے سجادوں کا طواف شروع کر دیتی ہیں۔ بعض عورتیں مَنّت مانتی ہیں کہ بیٹا ہوا تو عشرۂ محرم پر اُسے چاندی کی ہنسلی پہنائیں گی۔ بعد میں یہ ہنسلی بیچ کر غریبوں کو کھیر کھلائی جاتی ہے۔ اِس مقصد کے لئے ذوالجناح پر چاندی کی چھوٹی چھوٹی چھتریاں اور پنجے چڑھانے کی منت مانی جاتی ہے۔ جس عورت کے گھر بڑی آرزوں کا بیٹا پیدا ہوا ہو اُسے مانگے تانگے کے کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ بسا اوقات کسی ولی کے نام پر بیٹے کے سر پر لٹ چھوڑ دی جاتی ہے۔ گویا جب تک یہ لٹ موجود ہے ولی مذکور اُس کی حفاظت کرتا رہے گا۔ جب یہ لڑکا بارہ برس کی عمر کو پہنچتا ہے تو ولی کے مزار پر اسے مونڈوانے کی تقریب برپا ہوتی ہے۔ گانا بجانا ہوتا ہے، مٹھائی بٹتی ہے۔ بعض عورتیں بیٹے کو نظرِ بد سے محفوظ رکھنے کے لئے بچپن میں اُسے لڑکی کا لباس پہناتی ہیں۔ کسی زمانے میں بیٹی سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ اُسے باپ جان سے مار دیتا تھا کہ بڑی ہو کر رسوائی کا باعث نہ بن جائے۔ اِسلام سے پہلے بعض عرب قبائل میں بیٹی کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ مسلمان ہونے سے پہلے راجپوتوں اور گکھڑوں کے بعض قبیلوں میں دُختر کُشی کا رواج موجود تھا۔ چین قدیم میں بیٹیوں کو خشک سالی کے دوران میں لونڈیاں بنا کر ارزاں قیمت پر بردہ فروشوں کے ہاتھ بیچ دیتے تھے یا انہیں دریا میں ڈبو دیتے تھے کہ وہ اُن کا بوجھ نہ بن جائیں۔ یہ رسم پدری معاشرے میں شروع ہوئی جس میں معاشی پہلو سے بیٹے کو بیٹی پر ترجیح دی جاتی تھی اور مرد کی فوقیت عورت پر محکم ہو چکی تھی۔

بلوغت

دُنیا کی اکثر اقوام میں بلوغت کی تقریب اہتمام سے مناتے رہے ہیں۔ بلوغت کی رسوم ادا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اب لڑکا ماں باپ کی نگرانی کا محتاج نہیں رہا اور خود مختاری کی زندگی گذارنے کے قابل ہو گیا ہے۔ لڑکے کو احتلام ہونے اور لڑکی کے ایّام آنے کو بلوغت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ افریقہ کے بعض قبائل میں ایّام آنے کے کچھ روز بعد تک لڑکی کو سورج کی شعاعوں سے چھپاتے ہیں اور ایک اندھیری کوٹھڑی میں بند کر دیتے ہیں کہ کہیں سُورج اُسے حاملہ نہ کر دے۔ ہمارے ہاں حیض کو سر آنا، نہانا آنا، سر مَیلا ہونا، بے نمازی آنا، سر درد ہونا اور ناپاک ہونا کہتے ہیں پہلے ایّام آنے پر گھر کی عورتیں لڑکی کو اوڑھنی اُڑھانے کی رسم چھپ چھپ کر ادا کرتی ہیں۔ باپ نو بالغ لڑکے پر کڑی نظر رکھتا ہے اور رات کو اپنے کمرے میں سُلاتا ہے کہ کہیں وہ جنسی بے راہ روی کا شکار نہ ہو جائے۔

نرن ناری وحشی قبیلے میں لڑکے کی بلوغت کی رسم اُس کی ڈاڑھی کے پہلے بال نوچ کر ادا کی جاتی ہے۔ لڑکا درد کا اظہار نہیں کر سکتا۔ یُونان قدیم کے نوجوان اپنی ڈاڑھی کے پہلے بال دلفی کے مندر پر اپالو کو بھینٹ کیا کرتے تھے۔ روما میں جب کوئی نوجوان سترہ برس کا ہو جاتا تو اُسے بلوغت کا چُغہ پہننے کی اجازت مل جاتی تھی۔ اِس تقریب پر خوشی مناتے تھے۔ بلوغت کا چُغہ پہنتے ہی نوجوان حُسن و عشق کی دیوی وینس کے معبد میں جا کر کسی دیوداسی سے اختلاط کرتا تھا گویا اپنی جوانی کا پہلا پھل بھینٹ کر رہا ہے۔ مشرقی افریقہ کے قبائل میں نو بالغ کے سامنے کے دو دانت توڑ دیتے ہیں۔ اگر وہ

درد کا اظہار نہ کرے تو اُسے بالغ سمجھ کر اُسے قبیلے کی ذمے داریاں سونپ دی جاتی ہیں۔ پنجاب کے دیہی علاقے پھالیہ کی تحصیل میں جب تک کوئی نوجوان چوری نہیں کر لیتا اُسے پگڑا باندھنے کی اجازت نہیں ملتی یعنی اُسے بالغ تسلیم نہیں کرتے۔

مجوسی اور برہمن آغازِ شباب پر جنیو یا گستی پہناتے ہیں۔ مجوسیوں کا گستی اوستا میں اہورامزدا کے جو بہتّر نام ہیں اُن کی رعایت سے بہتّر دھاگوں سے بٹا جاتا ہے۔ ہندو جنیو پہنانے کی تقریب کو "اپناٹنا" کہتے ہیں۔ جنیو پہناتے وقت برہمن نوجوان کی عمر زیادہ سے زیادہ سولہ برس کی، چھتری کی بائیس برس کی اور ویش کی چوبیس برس کی ہوتی ہے۔ اِس تقریب پر پنڈت لڑکے کو منتر گایتری پڑھ کر سُناتا ہے۔ اِس کے بعد لڑکے پر صبح، دوپہر اور شام کی پُوجا واجب ہو جاتی ہے۔ ہندوؤں کے ہاں زندگی کے چار آشرم ہیں: پہلا برہم چاری جب لڑکا مجرّد رہ کر تعلیم حاصل کرتا ہے۔ برہم چاری کے لئے پان چبانا، پھولوں کے ہار پہننا، ماتھے پر چندن کا ٹیکا لگانا اور آئینہ دیکھنا ممنوع ہے کیوں کہ اِس سے جنسی جذبے کے بھڑک اُٹھنے کا احتمال ہوتا ہے۔

بعض اقوام میں لڑکے کے بالغ ہوتے ہی اُسے ایک نوعمر لونڈی دی جاتی تھی تاکہ وہ جنسی انحراف سے بچا رہے۔ مسلمانوں میں بھی اِس کا رواج تھا۔ جب ہارونؔ بالغ ہوا تو اُس کے باپ مہدیؔ نے اُسے محیاۃ نامی ایک کنیز عطا کی جس کے بطن سے ہارونؔ کا ایک بیٹا پیدا ہوا۔ روس کے مشہور ناول نویس لیو ٹالسٹائے نے لکھا ہے کہ جب اُس کا بڑا بھائی نکولسؔ سنِ بلوغت کو پہنچا تو باپ نے اُس کے پاس ایک لونڈی بھیج دی جس کے بطن سے نکولسؔ کی اولاد بھی ہوئی۔

آج کل کے علمائے نفسیات کی طرح قُدماء کو بھی اِس حقیقت کا شعور تھا کہ جنسی پہلو سے آغازِ شباب کا دَور بڑا نازک اور پُرخطر ہوتا ہے اور کئی نو بالغ لڑکے لڑکیاں مناسب

راہنمائی نہ ہونے کے سبب جذباتی شورش میں مُبتلا ہو کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ جنوبی ہند کے ماریا قبیلے والوں نے اِس مسئلے کو یوں حل کیا ہے کہ کنوارے نوخیز لڑکے لڑکیوں کے لئے ایک علاحدہ جھونپڑا بنا دیا جاتا ہے جسے گھوٹل کہتے ہیں۔ مُنڈا قبائل میں ایسے جھونپڑے کو گتورا اور بھوٹیا قبیلے میں ڈانگر داسا کا نام دیا جاتا ہے۔ رات کی تاریکی میں کنوارے نوجوان اور بن بیاہی لڑکیاں اِس جھونپڑے میں اکھٹے ہوتے ہیں۔ اِس میں شادی شُدہ عورتوں مردوں کو داخلے کی اِجازت نہیں ہوتی۔ جو لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو پسند کر لیں وہ جنسی ملاپ کرتے ہیں۔ صُبح سویرے مُنہ اندھیرے سب اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ملاپ کرنے والوں کا ایک دوسرے سے بیاہ بھی ہو۔ بیاہ اُن کے اپنے منگیتروں ہی سے ہوتا ہے۔ [لے]

لے RACES AND CULTURES OF INDIA, D.M. MAJUMDAR.

بیاہ

علم انسان کے طلبہ ہمیں بتلاتے ہیں کہ شادی بیاہ کا آغاز پدری معاشرے میں ہوا جو زرعی انقلاب کے بعد صورت پذیر ہوا تھا۔ قدیم مادری نظامِ معاشرہ میں عورت قبیلے کا محور سمجھی جاتی تھی بچے باپ کے نام سے نہیں ماں کے نام سے پہچانے جاتے تھے اور ماں ہی کے وارث ہوتے تھے۔ عملِ تولید میں عورت ہی کو کلیدی اہمیت دی جاتی تھی۔ مرد کو عورت سے جنسی تمتع کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا اور وہ عورت کی خدمت کر کے ہی اس سے فیض یاب ہو سکتا تھا۔ بیٹے بیٹیاں باپ کے بجائے ماموں کو اپنا حقیقی سرپرست جانتے تھے۔ عورت اور املاک کا اشتراک تھا۔ جھونپڑوں، کھالوں اور ہتھیاروں کی طرح عورتیں اور بیٹے بیٹیاں مشترک سمجھی جاتی تھیں۔ بکارت کا تصور ناپید تھا اور باکرہ لڑکیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ آج بھی افریقہ، آسٹریلیا، جنوبی امریکہ اور جزائر بحرالکاہل کے وحشی باکرہ سے بیاہ کرنا پسند نہیں کرتے۔ جنوبی ہند کے جنگلی قبائل ٹوڈا، منڈا، گونڈ، نٹ، سانسی، موریا اور ڈوم میں کنواری لڑکیوں کے جنسی ملاپ پر کوئی قدغن نہیں ہے لیکن بیاہتا عورت کی عصمت کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔

زرعی انقلاب کے بعد انسان نے شکار کی تلاش میں جنگلوں میں مارے مارے پھرنے کے بجائے دریاؤں کے کناروں پر بستیاں تعمیر کرلیں اور فصلیں اگانے لگے۔ زرعی انقلاب کے ساتھ پیداواری وسائل بھی بدل گئے تھے جس سے نئے پیداواری علائق اور نئی نئی اخلاق و معاشرتی قدروں نے جنم لیا۔ بکارت کا تصور پیدا ہوا جو شخصی املاک کے نئے ادارے ہی کی ایک فرع تھی۔ ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ اپنی ذاتی زرعی

املاک اپنے ہی صلبی فرزند کے لئے میراث میں چھوڑے چنانچہ یہیں سے باکرہ لڑکیوں سے نکاح کی ابتدا ہوئی اور کنواری لڑکیوں کی عصمت کی کڑی نگرانی کرنے لگے۔ مرد نے اراضی، گائے بیلوں اور بھیڑ بکریوں کی طرح عورت کو بھی شخصی املاک میں شامل کر لیا جیسا کہ شاہ حمورابی کے ضابطۂ قوانین سے معلوم ہوتا ہے۔ اس ضابطے میں اُن تمام کاموں کو جرائم میں شمار کیا گیا ہے جن سے کسی شخص کی ذاتی املاک پر زد پڑتی ہو۔ چنانچہ ڈاکے، چوری کی طرح اغوا اور زنا بالجبر کو بھی سنگین جرم قرار دیا گیا کیونکہ عورت بھی شخصی املاک بن کر رہ گئی تھی۔

قدیم زمانوں میں بیاہ کی اُن رسموں کا نام و نشان تک نہ تھا جو بعد میں مذہب، رواج اور نظریات کی ترویج سے تشکیل پذیر ہوئیں۔ باپ اپنی بیٹیوں کو ذاتی املاک کی طرح بیچ دیتا تھا یا انہیں گائے بیلوں اور زرعی اجناس سے بدل لیتا تھا۔ یہ روایت آج بھی کہیں کہیں دکھائی دے جاتی ہے مثلاً حالیہ انقلابات سے پہلے ایران اور افغانستان میں دختر فروشی کا رواج عام تھا۔ قبائلی علاقے میں آج بھی بیٹی کی قیمت وصول کی جاتی ہے۔ یہودی بھی بیویاں خرید کرتے تھے۔ انقلاب سے پہلے چین میں قحبہ خانوں کے مالک غریب ماں باپ سے سستے داموں اُن کی بیٹیاں خرید لاتے تھے اور اُن کی کمائی کھاتے تھے۔

بیاہ کا ایک طریقہ یہ تھا کہ ایک قبیلے والے اچانک دوسرے قبیلے کی فرودگاہ پر حملہ کر کے اُن کی عورتیں اُٹھا لاتے تھے جیسے کہ قدیم زمانے کے رومی سبائن قبیلے کی لڑکیاں بھگا لاتے تھے۔ سپارٹا کی زبان میں شادی کے لئے جو لفظ تھا اُس کا لغوی معنی ہے "پکڑ لینا"۔ ہمارے ہاں بارات اسی روایت سے یادگار ہے۔ بارات میں ایک سو یا دو سو مرد شامل ہوتے ہیں۔ لڑکی کے میکے والیاں باراتیوں پر روڑے اور خشک اُپلے برساتی ہیں اور سٹھنیوں (گالیاں جو دلہا کی عزیز عورتوں کو دی جائیں) سے اُن کی تواضع کرتی ہیں گویا وہ حملہ آوروں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ بیاہ کا ایک اور طریقہ یہ تھا کہ اُمیدوار کو لڑکی کے ماں باپ کی معینہ مدت تک خدمت کرنا